ڈاکٹر روبینہ ترین / محمد خاور نوازش
پروفیسر وصدر شعبہ اردو، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
استاد شعبہ اردو، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

سر سید احمد خاں کی سیاسی کارگزاریاں: ایک محاکمہ

Dr Rubina Tareen

Professor, Head Department of Urdu,

Bahauddin Zakariya University, Multan

Khawar Nawazish

Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

A Study of Sir Syed Ahmad Khan's Political services

Sir Syed Ahmed Khan is known for his work in politics and religion. His primary concentration remains religion until 1857 when he takes the role of a political activist for guiding the Indian Muslims. He believes that a writer has to be socio-politically committed to some cause and his publication 'Asbab Baghawat-e-Hind'(The Causes of Indian revolt) published in 1859 amply strengthens this point of view. Also, the spirit of his educational reforms was political too. In his advocacy for rationalism and enlightenment, he has to face immense resistance by the orthodox majority of Muslims, but he remains unshakable as a visionary entity. The given paper encircles his political services for India which enabled her to assert her existence in the fog of colonial forces.

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا سیاسی زوال دراصل اُن کے دورِ ابتلا کا آغاز تھا۔ ایک طرف مغربی استعمار کی انھیں تباہ کرنے کی مساعی اور دوسری طرف خود مسلمانوں نے انگریز کی پالیسیوں، تمدنی بود و باش، علوم، زبان یہاں تک کہ لباس سے بھی شدید نفرت کا اظہار کیا اور حکومت کے ساتھ مخاصمانہ رویہ اور عدم تعاون کی راہِ عمل اختیار کی جس کی نتیجے میں وہ اپنی اقدار و روایات سے دُور ہوتے گئے اور بلند حوصلگی، رواداری، سیاسی تدبر اور علم کی جستجو کی بجائے تنگ نظری اور تعصب کا اس حد تک شکار ہوئے کہ اب اُن کا رفتارِ زمانہ کے ساتھ چلنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ اس نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی جبریت نے مسلم متوسط طبقے کو نچلے طبقے میں ضم ہونے پر مجبور کر دیا۔ ایسے میں بقا کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ بدیسی

آقاؤں کو حاکمِ وقت مانتے ہوئے نوآبادیاتی نظام کو قبول کر لیا جائے اور اسی میں زندگی کے آثار تلاش کیے جائیں۔ اس فکر کا اولین سرچشمہ سرسید احمد خاں (۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) تھے۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں کہ:

''غیر ملکی آقاؤں سے تعلق استوار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ نوآبادیاتی نظام کو مکمل طور پر قبول کیا جائے اور اُس کے جملہ تقاضے پورے کیے جائیں لیکن اس نظام کے اندر دونوں طبقات کے درمیان کوئی انسانی رشتہ ممکن نہیں تھا۔۔۔۔ نوآبادیاتی صورتِ حال میں آقا اور غلام کے درمیان رشتے کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ کسی مقامی باشندے کو انسان تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظام مہذب ترین انسان کی شخصیت کو بھی مسخ کر دیتا ہے اور سب سے زیادہ انسان دوست نوآبادکار بھی اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر مقامی باشندوں کو جانور تصور کرنے لگتا ہے۔ بصورتِ دیگر ان کے درمیان موجود معروضی رشتے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ لہٰذا وہ نہ صرف مقامی باشندوں کو جانور تصور کرتا ہے بلکہ شعوری طور پر انہیں جانور بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس معروضی صورتِ حال میں جب ہندوستان کے مسلم متوسط اور بالائی طبقوں نے انیسویں صدی کے وسط میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کی تو انہیں اس صورتِ حال کے جبر کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا پڑا۔ اول اول سید احمد خان ان طبقات کے نظریہ ساز اور رہنما کی حیثیت سے ابھرے۔''(۱)

یوں تو سرسید احمد خاں کے افکار و خدمات کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں صرف اُن کے سیاسی افکار اور اُن سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے تجزیہ مقصود ہے جو سرسید نے عملی طور پر انجام دیتے ہوئے اپنی قوم کے لیے روشنی اور آزادی کی اُمید پیدا کی۔ اُن کے فکر و عمل کے حقیقی میدان سیاست اور مذہب تھے جبکہ ادب کو وہ فکر اور عقائد کے اظہار اور مقاصدِ زندگی کا متبع اور آلۂ کار سمجھتے تھے انھوں نے جو کچھ تحریر کیا وہ بھی مخصوص سیاسی مقاصد اور عوامل کے زیرِ اثر تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے انھیں ادیب سے زیادہ ایک سیاسی مبصر اور مفکر قرار دیا ہے۔(۲) اس سے پہلے کہ سرسید کی سیاسی سرگرمیوں پر نظر ڈالی جائے یہ واضح کرنا بہت ضروری ہے کہ جس دور میں روشن خیالی اور خردمندی کی ایک مخصوص فکر لے کر سرسید سامنے آ رہے ہیں اُسی دور میں دوسری طرف مسلمانوں کا ایک طبقۂ فکر ایسا بھی تھا جس کا فکری سرچشمہ خالصتاً مذہبی عقائد تھے اور رہنمائی کے لیے شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) اور سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ء۔۱۸۳۱ء) کی تعلیمات اور عملی اقدامات تھے۔

دراصل یورپی حکمران یہ امر ضروری خیال کرتے تھے کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی باقیات کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں کا دینی اور مذہبی احساس مٹایا جائے تاکہ ان میں یک جہتی کا عنصر دوبارہ بیدار نہ ہو سکے۔ یہ ایک سیاسی حربہ تھا جس کے تحت یورپ کے علمی افکار کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا اور عیسائیت بالواسطہ اسلامی عقائد پر حملہ آور ہونے لگی۔ عیسائی سامراج مذہب اور سیاست کو الگ الگ رخنوں میں نہ رکھتا تھا لہٰذا ہندوستان میں مسیحی کلیسا کی بنیاد رکھنے کا منصوبہ کارگر سیاسی چال تھی جس کے تحت عیسائی مشنریوں نے نہایت منصوبہ بندی اور منظّم انداز میں مقامی لوگوں کے مذہب مخالف سرگرمیاں شروع کر دیں۔ یہی حالات اس خطے میں اصلاحی تحریکوں کے فروغ کی بنیاد بنے۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ء۔۱۸۳۳ء) اور سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ء، ۱۸۸۳ء) ایسی شخصیات ان تحریکوں کے روحِ رواں تھے جبکہ مسلمانوں میں سرسید احمد خاں ایک مصلح کے رُوپ میں سامنے آئے۔ سرسید کے اصلاحی امور کا اولین نکتہ مسلمانوں کی فلاح کے لیے حکمران طبقے سے تعاون تھا جبکہ علماء کرام کا وہ طبقہ جو اس فکر کے مخالف تھے' وہ تعاون پر ہرگز تیار نہ تھا۔ غلام رسول مہر رقمطراز ہیں کہ:

''علماء کرام کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ہر قسم کی سیاسی مشکلات کے باوجود انگریزوں سے تعاون کا روادار نہ ہوا۔ انھوں نے جا بجا خالص دینی درسگاہیں قائم کیں تاکہ مسلمانوں میں دینی حمیت کو زندہ رکھیں اور ان کے

لیے ان سے استفادے کے مواقع بہم پہنچائیں جو دین کے حقیقی سرچشمے تھے اور زوال کے بعد ان کے بہرہ مندی کے مواقع بڑی حد تک ختم ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں بہت سی درسگاہوں کے نام لیے جا سکتے ہیں جو اس برعظیم کے طول وعرض میں جا بجا قائم ہوئیں اور اب تک موجود ہیں۔ اس سلسلے میں جس درسگاہ نے سب سے بڑھ کر شہرت پائی وہ دیوبند کی درسگاہ تھی۔ اس کی بنیاد حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا محمد رشید گنگوہی نے رکھی۔''(۳)

مسلمان اربابِ فکر کی اسی طبقاتی تقسیم کے حوالے سے ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں کہ:

''اربابِ فکر کے دو طبقے ہو گئے ایک طبقہ جو علماء کرام کا تھا، اس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصاب درس کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اسی مقصد کے لیے عربی مدارس قائم کیے گئے اور ان کے ذریعے دینیات یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی سے متعلق علوم وفنون کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے برخلاف دوسرا طبقہ متجددین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی خیریت اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور اُن کے علوم سیکھیں۔''(۴)

علماء کا وہ گروہ جس کی طرف درج بالا دو اقتباسات میں اشارہ کیا گیا ہے مذہبی اصلاح اور سیاسی آزادی کا حامی تھا۔ اس نے بڑی ثابت قدمی سے بدیسی حکومت کی مخالفت کا سلسلہ جاری رکھا۔ مغربی تعلیم کے ضمن میں اُن کا خیال تھا کہ درپردہ عیسائیت کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ مسلمانوں میں سے ہی کچھ لوگ اس مغرب مخالف رجحان کی مخالفت میں بھی سامنے آئے' شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۵ء۔۱۸۲۳ء) نے ایک دور میں مسلمانوں کو جدید تعلیم کے حصول کی ترغیب دی تھی۔ کلکتہ مدرسہ اور دلی کالج میں مغربی تعلیم کے آغاز کا سلسلہ انہی رجعت پرست مخالف رویوں اور قوتوں کے نمود سے ممکن ہو سکا۔

سرسید احمد خاں اسی دور کی تعصّباتی فضا میں رجعت پرست مخالف عنصر کے طور پر سامنے آئے اور انھوں نے مذہب، تعلیم، سیاست اور ہر قسم کے رجحانات میں لبرل ازم کو فروغ دیا۔ سرسید کی سیاسی زندگی کا آغاز صحیح معنوں میں رسالہ ''اسباب بغاوتِ ہند'' کے منظرِ عام پر آنے سے ہوا' انگریز کے ذہن میں مسلمانوں کے حوالے سے پائی جانے والی متعصب سوچ کو سمجھتے ہوئے سرسید کو اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جس سرکشی کو بغاوت کا نام دے کر اُس کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کی جا رہی ہے اس کے حقیقی اسباب کے بارے میں ایک مربوط دستاویز بے حد ضروری ہے۔ بغاوت کے اسباب بیان کرتے ہوئے سرسید نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسیوں اور ہندوستانیوں کے حوالے سے اُن کے اقدامات پر تنقید کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی غلط فہمیاں رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب سے زیادہ زور ہندوستانی عوام کے رسم و رواج اور عقائد مخالف قوانین اور سیاسی نظام کے نفاذ اور قانون ساز کونسل میں ہندوستانیوں کی عدم شرکت پر دیا گیا ہے۔ سرسید ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا ذمہ دار برطانوی حکمرانوں کو ٹھہراتے ہیں۔ اسبابِ بغاوت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

''۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اُس کی شتابی میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گذشتہ میں فوج کی بغاوت نے اُس میں آگ لگا دی۔ جس قدر اسباب سرکشی کے جمع ہو گئے اگر غور کر کے سب کو احاطہ میں لایا جائے تو پانچ اصول مبنی ہوتے ہیں۔

۱۔ غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا۔

۲۔ جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریق حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں

کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

۳۔ ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور اُن مصائب سے جو اُن پر گزرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

۴۔ ترک ہونا اُن امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورنمنٹ پر ہندوستان کی حکومت کے لیے واجب اور لازم تھا۔

۵۔ بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی۔''(۵)

رسالہ ''اسباب بغاوتِ ہند'' کی تصنیف کا مقصد خالصتاً سیاسی تھا جو اس کا عنوان سامنے رکھنے سے ہی بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ مذکورہ اسباب کی پیش کش دراصل اُس طبقے کے لیے ہے جو اسے ہندوستانیوں کی بغاوت گردانتے ہوئے انتقامی لائحۂ عمل اختیار کیے ہوئے تھا۔ سید احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:

> ''سرسید نے (جو ابھی ''سر'' کے خطاب سے سرفراز نہیں ہوئے تھے) ''تاریخ سرکشی بجنور'' لکھی۔ اُس وقت تک انھوں نے مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کی رہنمائی کی باگ ڈور نہیں سنبھالی تھی۔ اس کی سیاسی زندگی کا آغاز اُن کی کتاب ''رسالہ اسباب بغاوتِ ہند'' کی اشاعت سے ہوتا ہے۔ یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی اور بعد میں اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب واقعات کا محققانہ تجزیہ بہم پہنچاتی ہے۔ وہ سارا الزام برطانوی پالیسی پر رکھتے ہیں جس کے سبب انگریز ہندوستانیوں کی خیر خواہی سے محروم ہو گئے، ان کا بیان ہے ''یہ سرکار کا کام تھا کہ وہ کوشش کرے اور رعایا کی ہمدردی حاصل کرے نہ کہ رعایا کا فرض کہ وہ حکومت کے لطف و کرم کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔''(۶)

سرسید احمد خاں کے تصورات شروع دن سے ہرگز یہ نہیں تھے بلکہ یہ تبدیلی ۱۸۵۷ء کے بعد رونما ہوئی۔ اس سے قبل زندگی کی مادی اقدار اور عصری تناظر سے اُن کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ خالصتاً دینی اور عملی نقطۂ نظر رکھتے تھے اور تاریخ اور تجرید سے خاص شغف تھا۔ اسی بنا پر اُن کی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تصانیف میں مذاہب کا تقابل، تاریخی احوال، مجرد تصورات پر مباحث اور دیگر علمی مناظرے ہی ملیں گے۔

۱۸۵۷ء کے واقعات سے سرسید براہِ راست متاثر ہوئے اور انگریز کی ملازمت میں انھیں حکمرانوں کی پالیسیوں کو قریب سے سمجھنے کے مواقع بہم میسر آئے۔ ہنگاموں کے بعد مسلمانوں کے ابتر حالات کو دیکھتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمان اب ذلت اور رسوائی کی جس پست ترین سطح تک پہنچ چکے ہیں وہاں سے نکلنا صرف اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے کہ انھیں جہالت کی تاریکی سے نکال کر زندگی کی دوڑ میں شمولیت کی طرف لایا جائے اور حکمرانوں کے ان کی بابت احساسات میں تغیر واقع ہو۔ موخر الذکر مقصد کے تحت ہی ۱۸۵۹ء میں رسالہ ''اسباب بغاوتِ ہند'' شائع ہوا جس میں سرسید نے بغاوت کے پانچ بڑے اور چنیدہ اسباب بیان کیے ہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے ان پانچ اسباب کی تفصیل درج کرتے ہوئے انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسیوں اور ہندوستانیوں کے حوالے سے ان کے عملی اقدامات پر تنقید کرتے ہوئے بغاوت کے اسباب کے ضمن میں برطانوی حکمرانوں کی بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور سب سے زیادہ اہمیت ہندوستانی عوام کے رسم و رواج اور عقائد و نظریات کے خلاف قوانین اور سیاسی نظام کے نفاذ اور قانون ساز کونسل میں ہندوستانیوں کی عدم شرکت کو دی۔ ۱۸۵۹ء میں جب سرسید کی یہ کتاب شائع ہوئی تو وہ صدر الصدور کے عہدے پر ترقی پا کر مراد آباد آچکے تھے، مراد آباد میں انھیں سرکار کی طرف سے ایک اسپیشل ٹریبونل کی رُکنیت کا کام بھی سونپا گیا جو باغی قرار دے کر ضبط کی جانے والی جائیدادوں کو واگذار کرانے کا تھا جسے انھوں نے بطریق احسن انجام دیا۔ اسی سال انھوں نے مراد آباد میں ایک فارسی مدرسہ

بھی قائم کیا اور حکومت کو ایک عرضداشت کے ذریعے ہندوستانیوں کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مناسب انتظام کرنے کو بھی کہا گیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت کی بہتری کے لیے سرسید کی اولین مساعی کے نقوش یہیں سے ملتے ہیں۔

''اسباب بغاوتِ ہند'' میں یوں تو سرسید نے اپنی دانست میں پوری کوشش کی کہ بغاوت کے حقیقی اسباب کو نہایت محققانہ اور تجزیاتی انداز میں برطانوی حکمرانوں کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ اُن کی غلط فہمیاں دُور ہو سکیں لیکن اس کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے لہٰذا مرادآباد قیام کے دوران ہی انھوں نے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایک ایسی مبسوط دستاویز ترتیب دینے کا منصوبہ بنایا کہ جس میں ہنگامۂ اٹھارہ سو ستاون سے پہلے اور اس کے دوران مسلمانوں کی اُن خدمات اور اقدامات کا بیان ہو جو برطانوی حکومت سے اُن کی وفاداری کا ثبوت دیں۔ مولانا حالیؔ رقمطراز ہیں کہ:

> ''اس کتاب کا موضوع یہ قرار دیا تھا کہ اطرافِ ہندوستان میں جس قدر مسلمانوں نے گورنمنٹ کی خیر خواہیاں اور انگریزوں کی حمایت کے لیے جانبازیاں کی ہیں۔ اُن میں سے ہر شخص کا حال مفصل اور مشرح نہایت صحت کے ساتھ قلم بند کیا جائے اور ہر شخص کے متعلق گورنمنٹ، حکام اور افسروں کی تمام چٹھیاں اور سٹیفکیٹ بہم پہنچا کر اس کی سرگزشت کی ذیل میں نقل کی جائیں اور جو کچھ اُن کی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے جاگیر یا پنشن یا انعام یا خلعت وغیرہ عنایت کیا ہو وہ سب بیان کیا جائے۔''(۷)

اس مقصد کے تحت رسالہ ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' (خیر خواہان مسلمان) کا ۱۸۶۰ء میں اجراء ہوا۔ سرسید کا یہ اقدام بھی خالصتاً سیاسی مصلحت کے تحت تھا۔ اس رسالے کے ذریعے مسلمانوں کی مثبت سرگرمیاں اُجاگر کرنا ایک طرف، سرسید نے اُس دور کا ایک منفرد اور نیا نظریہ بھی پیش کیا کہ ہندوستان میں جو قوم مذہب اور عادات و مزاج کے (کذر) رو سے عیسائیوں سے محبت، اخلاص، ارتباط، یگانگت پیدا کر سکتی ہے وہ مسلمان ہی ہے اور دوسرا کوئی نہیں۔(۸) ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' کے تیسرے اور آخری شمارے میں لانس لٹ اڈیسن نام کے ایک قدیم عیسائی مصنف کی کتاب سے جو اس نے ۱۶۹۷ء میں اسلام کے ابتدائی حالات پر لکھی تھی، ایک عہد نامہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے عیسائیوں کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا اس میں ان کی قوم کو تقریباً مسلمانوں ہی کے برابر حقوق دیے تھے اور مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ اس پر ہمیشہ کاربند رہیں۔(۹) اس سلسلے کے دوسری کڑی ''تبیین الکلام'' تھی۔ سرسید نے یہ کتاب لکھنے کا آغاز مرادآباد قیام کے دوران ہی کر دیا تھا۔ مئی ۱۸۶۳ء میں اُن کا تبادلہ غازی پور ہو گیا جہاں یہ کتاب اپنی تکمیل کو پہنچی۔ سرسید کی اس تصنیف کا موضوع واضح کرتا ہے کہ یہ سرسید کے اسی سیاسی مقصد کے تحت اُٹھایا گیا قدم تھا جس کا آغاز ''اسباب بغاوتِ ہند'' سے ہوا تھا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مذہب کے موضوع پر ہونے والے مباحثوں اور مناظروں پر سرسید گہری نظر رکھتے تھے اور اس تصنیف کے ذریعے عیسائیوں کی اُس غلط فہمی کو رفع کرنا چاہتے تھے جو بائبل مقدس کی بنیاد پر اسلامی اصول و نظریہ کی بابت اُن میں موجود تھی۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے انجیل اور قرآن کے اختلافات میں مطابقت وار دونوں الہامی کتب کی اُصولی وحدت کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مولانا حالیؔ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''اس کتاب میں تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی اور بڑی محنت اور تحقیق اور تلاش سے لکھے ہیں جن میں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے نہایت عمدہ اور قیمتی اطاعیں مندرج ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت تمہید ہیں اس مذہبی تنافر کے دُور کرنے کی جو دونوں قوموں کے تعصب، لاعلمی اور ایک دوسرے کے مذہب سے ناواقفیت کے سبب طرفین کے دلوں میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔''(۱۰)

مظہر حسین اس تصنیف کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''تبئیسن الکلام کا لکھنا بھی انگریز عیسائی حکمرانوں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات استوار کرنے کی طرف ایک ریڈیکل قدم تھا۔اس کے نتیجے میں ان دونوں فرقوں کے دقیانوسوں کے درمیان پیدا ہونے والے ردِعمل کی پیش بینی بھی انہوں نے کر لی تھی لیکن چونکہ اپنے مقصد میں اٹل تھے اس لیے دقیانوس مسلمانوں اور عیسائیوں کی تنقید اور نکتہ چینی کی پرواہ کیے بغیر وہ اپنے مقصد کی طرف گامزن رہے۔تبئیین الکلام کھنے کا اصل مقصد تو انگریز عیسائی حکمرانوں اور مسلم رعایا کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنا تھا لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید نے بائبل کی تفسیر کے ذریعے عیسائیوں کی مذہبی کتاب کے متعلق مسلمانوں میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔''(۱۱)

اس ضمن میں سرسید احمد خاں کے خیالات پر مبنی ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس سے اُن کی مذکورہ سعی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''عیسائی مذہب میں جس قدر اختلاف [عقیدہ تثلیث پر] ابتدا ابتدا میں ہوئے اس کی تاریخ ہمارے پاس نہایت تاریک ہے پھر اُس اختلاف کے منشا کو اگر ہم اپنی رائے کے بموجب قرار دیں تو بلاشبہ ہم غلطی میں ہیں کیونکہ جس طرح ہم اُس اختلاف کو ایک برے منشا پر قائم کرتے ہیں اسی طرح ممکن ہے کہ ہم اُس کو ایک اچھے منشا پر قائم کریں۔پس جب تک کہ ہم کو خود انھی لوگوں کے کلام سے یہ نہ ثابت ہو کہ اُن کا منشا اُس اخلاف میں کیا تھا اُس وقت تک ہم کو اپنے خیالات سے اُن کے اختلافات کا منشا قرار دینا ایک ناانصافی ہی نہیں ہے بلکہ ایک خیالی بات کو واقعی مان لینا ہے۔''(۱۲)

غازی پور میں قیام کے دوران انھیں ہندوستانی ذہن کو جدید مغربی علوم سے آگہی فراہم کرنے کا بھی خیال آیا کہ مادی ترقی کا خواب اس کے بغیر پورا ہونا ممکن نہ تھا پس ایک علمی سوسائٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا جو سائنس وٹیکنالوجی اور مغربی لٹریچر کو اُردو زبان میں منتقل کرنے کا کام انجام دے۔اُن کا خیال تھا کہ اس اقدام سے انگریزوں اور مقامی باشندوں کے درمیان حائل نفرت کی فصیل گرانے میں کسی قدر مدد مل سکتی ہے اور ہندوستانیوں کا معیارِ زندگی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔علمی مقاصد سے ہٹ کر اس سوسائٹی کے قیام کے پس منظر میں سیاسی مقصد زیادہ کارفرما تھا۔سرسید چاہتے تھے کہ انگریز، ہندو اور مسلمان تینوں کے درمیان میل جول اور ربط پیدا ہو جو انھیں ایک علمی پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے سے ممکن ہو سکتا تھا سو ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی اور سرسید اس کے آنریری سیکرٹری قرار پائے۔اسی برس انھوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ وکٹوریہ اسکول کے نام سے قائم کیا جو کلکتہ کے مدرستہ العلوم کی طرز پر تھا اور اس میں انگریزی، اُردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس مدرسے میں بھی وہ جدید علوم کی ترویج کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اسی اثنا میں ۱۸۶۴ء میں اُن کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا اور سائنٹفک سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہو گئی۔علی گڑھ میں اس سوسائٹی نے ترقی کی بہت سی منازل طے کیں اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کی سرپرستی اسے حاصل رہی، سوسائٹی کے پریزیڈنٹ مسٹر ولیم جنکسن بریملی جو علی گڑھ میں بطور جج خدمات انجام دے رہے تھے، نے اس ترقی میں خاطر خواہ کردار ادا کیا۔زاہد چودھری لکھتے ہیں کہ:

''انگریزوں کی جانب سے اس کام میں سرسید کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بالائی ہندوستان کی رعایا کو بھی انگریزی سیاست، معاشرت اور ثقافت سے اس طرح مرعوب ومغلوب کرنا چاہتے تھے جس طرح کہ انہوں نے قبل ازیں راجہ رام موہن رائے وغیرہ کی وساطت سے بنگال کی رعایا کو کیا تھا۔فرق یہ تھا کہ راجہ رام موہن رائے نے انگریزوں کے سرپرستانہ تعاون سے صرف ہندوؤں کو جدید علوم سے روشناس کر دیا تھا جبکہ سرسید احمد خاں بالائی ہندوستان کی بلالحاظ مذہب وملت ساری رعایا کو مغربی علوم سے مستفید کرانے کا متمنی

تھا۔''(۱۳)

۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء کو سائنٹفک سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' جاری کیا گیا جو شروع میں ہفتہ وار تھا اور پھر ہفتہ میں دو بار نکالا جانے لگا۔ سرسید احمد خان اس کے مدیر تھے۔ اس گزٹ کے اجراء کا بنیادی مقصد ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا اور برطانوی حکام کو ہندوستانی عوام کی حالتِ زار سے آگاہ کرنا تھا۔ یہ بھی دراصل تصنیف وتالیف کے اُسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس کے تحت انگریز اور مقامی باشندوں کے درمیان قربت کی فضا پیدا کرنے کا کام سرسید نے ۱۸۵۷ء کے بعد شروع کر دیا تھا۔ مولانا حالی اس گزٹ کی بابت یوں رقمطراز ہیں:

> ''اوّل اوّل سرسید زیادہ تر اس میں پولیٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔۔۔۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرزِ حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آج تک کوئی پرچہ ہندوستان میں اس اخبار کے سوا ایسا نہیں نکلا جس سے یہ دونوں مقصد پورے ہو سکیں۔''(۱۴)

مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کا ایک اور سیاسی اقدام 'علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن' کا قیام تھا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت میں سرسید نے چند انگریزی افسران اور مقامی رؤسا کو اکٹھا کر کے یہ تجویز پیش کی کہ شمال مغرب کے تمام اضلاع کی ایک ایسی ایسوسی ایشن ہونی چاہیے جو تمام مسائل ومقاصد کو پارلیمنٹ تک پہنچائے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ مقامی لوگوں کے تمام معاملات صرف کورٹ آف ڈائریکٹرز تک پہنچتے ہیں اور پارلیمنٹ کے ممبران ان سے آگاہ نہیں ہو پاتے سو سرسید کی اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے ہندو اور مسلمان دونوں طبقات کے کچھ معززین کو 'علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن' کا ممبر مقرر کیا گیا۔ یہ ایسوسی ایشن اُس وقت تک سرگرمِ عمل رہی جب تک سرسید علی گڑھ میں رہے اور حکومتِ ہند کو مختلف عرضداشتوں کے ذریعے چند مسائل کا تصفیہ بھی کرایا گیا جن میں کتابوں کی ترسیل پر محصول میں کمی اور مسافرانِ ریل کے مسائل وغیرہ شامل تھے۔(۱۵) یکم اگست ۱۸۶۷ء کو سرسید نے متذکرہ ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرائے و گورنر جنرل کے نام شمال مغرب میں ایک ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کے لیے درخواست بھیجی۔ یہ سرسید کا ایک ایسا انقلابی اقدام تھا جس کے بہت دُوررس اثرات مرتب ہوئے۔ درخواست کے آغاز میں انھوں نے تعلیم کی غرض وغایت اور اہمیت بیان کرتے ہوئے مروجہ طریقۂ تعلیم کو ناقص قرار دیا اور سول انجینئرنگ کالج رڑکی اور میڈیکل کالج آگرہ جہاں نصابی کتب انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر کے پڑھائی جاتی تھیں، کی مثالیں دیں اور مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام پر زور دیا۔ ورنیکلر سے سرسید اور اُن کے رفقاء یعنی ارکانِ برٹش انڈین ایسوسی ایشن وارکانِ سائنٹفک سوسائٹی (جس میں ہندوستانی اور انگریز سب شریک تھے) کی مراد اُردو زبان تھی کیونکہ ہندی زبان کی حیثیت اُس وقت ایسی نہ تھی کہ اس بار کی متحمل ہو سکتی۔(۱۶) ڈاکٹر صفیہ بانو اس مجوزہ ادارے کے قیام کا مقصد بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> ''مقصد یہ تھا کہ یا تو اس غرض کے لیے یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں وہ تمام علوم وفنون جو یونی ورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں اس درس گاہ میں دیسی زبانوں کے ذریعے سے پڑھائے جائیں۔ ویسے ہی امتحان ہوں جیسے کلکتہ یونی ورسٹی میں ہوتے ہیں اور اس کے طالب علموں کو ویسی ہی سندیں دی جائیں جو کلکتہ یونیورسٹی کے کامیاب طلبہ کو دی جاتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایسی کتابیں دیسی زبانوں میں موجود نہیں تھیں لیکن جو

کتابیں یونی ورسٹی کے نصاب میں تھیں ان کے ترجمے تیار کیے جا سکتے تھے لیکن اس تجویز کو نا منظور کر دیا گیا۔''(۱۷)

زاہد چودھری نے سرسید کی اس مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد کے تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''سرسید کی جانب سے یہ تجویز پیش کیے جانے کی بظاہر سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی سیاست، معیشت، معاشرت اور ثقافت پر بنگالیوں کی بالادستی کو پسند نہیں کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کی بجائے صوبہ جات آگرہ واودھ کی بالادستی قائم ہو۔ بنگالی انگریزی تعلیم میں تقریباً ایک سو سال آگے تھے جبکہ یو۔پی کے لوگوں نے ابھی انگریزی تعلیم کی ابتداء کی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سرسید کھلم کھلا مسلمانوں کا سب سے بڑا بہی خواہ تھا اور اس بنا پر اس کی خواہش تھی کہ اُردو فیکلٹی یا اُردو یونیورسٹی کے قیام سے مسلمانوں کے لیے ترقی کی راہیں کھولی جائیں لیکن اسے یہ تجویز پیش کرتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تاریخی تضاد میں شدت پیدا ہوگی اور ایک نیا فرقہ وارانہ جھگڑا کھڑا ہو جائے گا جس سے برطانوی سامراج فائدہ اُٹھائے گا اور برصغیر میں فرقہ وارانہ مفاہمت کا جو تھوڑا بہت امکان تھا وہ بھی ختم ہو جائے گا۔''(۱۸)

مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اول تو یہ کہ سرسید کسی حد تک سرکار کے اس ارادے کو بھانپ گئے تھے کہ وہ انگریزی تعلیم کا ایک سلسلہ جو کلکتہ یونیورسٹی میں پہلے سے جاری تھا کو روک کر صرف دیسی زبانوں میں تعلیمی سلسلہ شروع کرنا چاہتے ہیں اور کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر کے اُس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے ہیں اور دوم سرسید کو اس بات کا بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس منصوبے میں ہندو رخنہ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ ۱۵/اگست ۱۸۶۷ء کو جب سرسید ترقی پا کر علی گڑھ سے بنارس گئے تو انھیں ادراک ہوا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان زبان کے مسئلے پر مخاصمت کی فضا وہاں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ ہندوؤں میں سے کچھ لوگ یہاں تک خیال رکھتے تھے کہ سرکاری عدالتوں میں اُردو اور فارسی کی جگہ ہندی رائج ہونی چاہیے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب سرسید کو احساس ہوا کہ ہندوستانیوں کے لیے بحیثیت مجموعی کوششوں سے کچھ حاصل نہیں کہ یہ دونوں قومیں مشترکہ مفادات کے لیے خود ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں چل سکتیں۔ ہندوؤں کے اس رویے پر اُن کا ردِعمل بہت سخت تھا۔ بلاشبہ اس رویے کے تناظر میں مذہب کا پہلو زیادہ شدت کے ساتھ موجود تھا اور اسے سیاسی سطح پر اُبھارنے میں متوسط طبقے کے اپنے مفادات کو دخل تھا۔ سرسید کے ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کو بھی مستقبل قریب میں یہی رنگ دینے کی کوشش کی جا سکتی تھی کیونکہ انگریز حکمران سیاسی سطح پر اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے اس قسم کی فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دیتے رہتے تھے۔ بقول سید احتشام حسین:

''متوسط طبقہ اگر اپنے مفادات کے لیے متحد اور متفق ہو سکتا ہے تو اپنے جماعتی یا فرقہ وارانہ مفاد کے لیے دوسرے فرقوں کا مخالف بھی بن سکتا ہے۔ چنانچہ سرسید اگر ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے آواز بلند کرتے تھے تو دوسری طرف محض مسلمانوں کے حقوق کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ انگریزی سیاست اس جذبہ کو مسلسل ہوا دے رہی تھی۔۔۔۔ اس پالیسی کا شکار ہندو اور مسلمان دونوں ہوتے تھے اس لیے کبھی ''ہندی، ہندو، ہندوستانی'' کا نعرہ لگایا جاتا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں لیکن سرسید کی ابتدائی سیاسی زندگی میں اس تنگ نظری کا پتہ نہیں چلتا، اگر وہ مسلمانوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے تو اس لیے کہ انگریز مسلمانوں کو غدر کا بانی سمجھ کر زیادہ پیس رہے تھے تاہم اُس وقت کا ہندوستان اپنے غیر متوازن اور ناہموار قومی ارتقاء کی وجہ سے مذہبی اختلاف کے جراثیم کی پرورش بھی کر رہا تھا۔''(۱۹)

قیامِ بنارس کے دوران سرسید کے نظریات میں بنیادی تبدیلی رُونما ہوئی جس کی بنیاد ہندو سربرآوردہ شخصیات کی جانب سے فرقہ پرستانہ روّیہ کی تقویم تھی۔ انگریزی مدارس کی تعلیم سے ہندوؤں کی نسبتاً زیادہ تعداد مستفید ہوتی تھے اور نصابی کتب میں بالخصوص تاریخ کے موضوع پر انھیں جو تعلیم دی جاتی اُس میں مسلمانوں کے دورِ اقتدار کی ظالمانہ کاروائیوں اور نظام کی بہت سی خامیوں کی نشاندی دانستہ طور پر کی جاتی جس سے تعصب کی فضا خود بخود پیدا ہوتی چلی گئی۔ پھر اس روّیہ کو قومی سطح پر اُبھارنے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں بہت سی انجمنیں اور سبھائیں بھی سرگرم ہوگئیں۔ کچھ مورخین نے اس صورتِ حال کا ذمہ دار سرسید کو بھی ٹھہرایا ہے کہ مرادآباد اور غازی پور میں مدرسے کھولنے سے لے کر سائنٹفک سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' نکالنے تک اور پھر ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کی درخواست کے متن کو سامنے رکھا جائے تو سرسید اس حقیقت سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں کہ اپنی تقاریر اور تحاریر میں 'ہندوستانی' کا لفظ استعمال کرتے ہوئے وہ ہندوؤں کی اکثریت کو یوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ انھیں اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی ترویج کا برابر خیال ہے لیکن ہندی کے لیے انھوں نے کوئی اقدام نہیں کیے۔ انھیں اس بات کا مکمل احساس تھا کہ انگریز ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہراتے ہوئے انھیں سیاسی، معاشرتی اور معاشی طور پر بدحال کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے تھے لیکن یہ پہلو یکسر نظر انداز کرتے رہے کہ ہندو بھی تو ہندوستان میں پچھلی کئی صدیوں سے مسلمانوں کی بالادستی کے خاتمے کا انتظار کر رہے تھے گویا یہ فرقہ پرستانہ روّیہ کبھی نہ کبھی تو سامنے آنا ہی تھا خواہ زبان کی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو۔ سو یہ وہ تمام صورتحال تھی جس میں سرسید کے ہندو مسلم اتحاد کے نظریہ میں تغیر رونما ہوا۔

یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو سرسید انگلستان چلے گئے۔ وہاں انھوں نے انگریزوں کی تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی، اور معاشی زندگی کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا' وہاں کے تعلیمی اداروں کا دورہ کیا اور طریقۂ تعلیم پر غور کیا۔ ۲/اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید واپس ہندوستان آ گئے اور بنارس پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج سنبھالا۔ انگلستان سے واپسی پر سرسید نئے خیالات اور منصوبوں کے ساتھ وارد ہوئے جن میں مسلمان کی ترقی اور مذہبی، تعلیمی، سیاسی و معاشرتی اصلاح کا پہلو نمایاں تھا۔ اس غرض سے انھوں نے ۲۴/دسمبر ۱۸۷۰ء کو ''تہذیب الاخلاق'' کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا جس میں سب سے زیادہ مذہبی اصلاح کی غرض سے خود سرسید نے مقالہ جات لکھے۔ سرسید کے وہ رفقاء جو اس رسالے میں لکھتے رہے اُن میں محسن الملک، وقار الملک، مولوی چراغ علی اور مولانا حالی شامل ہیں۔ اس پرچے کی بے حد مخالفت ہوئی اور اسے اسلامی تعلیمات کے برخلاف قرار دیا گیا۔ چھ برس تک سرسید کی نگرانی میں یہ تواتر سے شائع ہوتا رہا اور پھر ۱۸۷۶ء میں جب وہ پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے تو یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ اپنے قریبی ساتھی نواب محسن الملک کے کہنے پر سرسید نے اس کا دوبارہ اجراء بھی کیا لیکن مزید تین سال ہی چل سکا۔ وہ سیاسی مقاصد جو اس اجراء کے تناظر میں موجود تھے کہ مذہبی رویوں میں اعتدال لانا اور مسلمانوں کو توہمات اور تعصّبات سے نکال کر جدیدیت کی طرف گامزن کرنا، ان میں سرسید کافی حد تک کامیاب رہے۔

''تہذیب الاخلاق'' دراصل اُس عظیم تحریک کا نقطۂ آغاز تھا جسے ہندوستان کی تاریخ میں سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کے نام سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ سرسید کی اس تحریک کے نقوش یوں تو انہی ایام میں واضح ہونا شروع ہو گئے تھے جب انھوں نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جو بعد میں اُن کے علی گڑھ آنے پر مستحکم ہوئی۔ ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کا اجراء اور ''علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' کا قیام بھی اسی تحریک کے اولین نقوش ہیں۔ علی گڑھ ابتدائی قیام کے دوران سرسید کی ان سرگرمیوں کو مسلمانوں کی سیاسی خدمت کا آغاز کہنا بے جا نہ ہوگا کیونکہ یہ کوششیں خواہ تعلیمی مقاصد کے ضمن میں کی جا رہی تھیں لیکن اصل مقصد قوم کو سیاسی تنزلی سے نکالنا تھا۔ انگلستان سے واپسی پر یہ خیال وہ اپنے ساتھ لائے تھے کہ مغرب نے ترقی کی منازل 'عیسائیت' کے پرچم تلے ہرگز طے نہیں کیں اور نہ مذہب کبھی کسی قوم کو اجتماعی سطح پر

جمود سے نکالنے میں وہ خاطر خواہ کردار ادا کرسکتا ہے جو اخلاقی تربیت اور جدید تعلیم کے فروغ میں پنہاں ہے۔ یہی فکر سرسید کی تحریک کو ایک مستحکم بنیاد فراہم کرتی ہے۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء کے ساتھ ہی ایم اے او کالج (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کے قیام کی کوششوں کا بھی آغاز ہوگیا۔

۲۶ر دسمبر ۱۸۷۲ء کو سرسید نے ''کمیٹی خواستگارِ ترقیِ تعلیمِ مسلمانان'' تشکیل دی جس کے ذمے مسلمانوں میں تعلیم کی طرف کم رجحان اور جدید تعلیم سے نفرت کی وجوہات دریافت کرنا اور اس کے حل کے لیے تدابیر نکالنا تھا۔ کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی اُس میں مسلمانوں کے لیے ایک کالج کے قیام اور طریقۂ تعلیم کے ضمن میں کچھ سفارشات درج تھیں۔ کمیٹی کی رپورٹ حکومتِ ہند اور مختلف صوبائی حکومتوں کو بھجوائی گئی جنہوں نے ایم اے او کالج کے قیام کی تجویز کی تائید کی اور ہر ممکن مدد کا یقین دلایا۔ اس حکومتی تائید اور حمایت کے بعد سرسید نے اس مجوزہ کالج کے لیے عوام سے چندہ جمع کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی تشکیل دی۔ فروری ۱۸۸۳ء میں سرسید کے بیٹے سید محمود نے انگلستان سے اس مجوزہ کالج کے طریقۂ تعلیم کی بابت ایک اسکیم بھیجی جسے سرسید نے حکومتِ ہند کو ارسال کیا اور ساتھ ہی اُس وقت کے بڑے علماء اکرام کو بھی اس کا مسودہ بھجوایا جس میں اُن سے پوچھا گیا کہ آیا اس طریقۂ تعلیم کے موافق ایک کالج کے قیام کے لیے چندہ اکٹھا کرنا جائز امر ہے؟ جواب میں سرسید کی مخالفت میں ایک محاذ بن گیا اور مختلف علماء نے سرسید کو ملحد قرار دینے میں بھی پس وپیش نہ کی۔ سرسید لکھتے ہیں کہ:

> ''ہم کو ملحد اور زندیق اور لا مذہب کہنا کچھ تعجب کی بات نہیں کیوں کہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کی رسم ورواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو اپنا دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخر الزمان محمد رسول اللہؐ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کیے ہیں اور کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنائی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اُس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسے ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جدِ امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہؐ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں پھر وہ لوگ ہم کو ملحد وزندیق ولا مذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کریں اور کیا سمجھیں کیوں کہ ہم اُن کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔''(۲۰)

اس مخالفت پر سرسید کے رفقاء مجوزہ ادارے کے قیام کے معاملے پر کچھ پست ہمتی کا شکار ہوگئے تو سرسید نے ایک مفصل مضمون ''تہذیب الاخلاق'' میں لکھا جس میں یہ تجویز دی گئی کہ تمام رفقائے کار اپنے اپنے خرچ پر مختلف علاقوں کا دورہ کرکے ادارے کے لیے چندہ اکٹھا کریں گے اور خود سرسید نے اس پر سب سے پہلے عمل کیا۔ یہ کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور اس قدر روپیہ جمع کرلیا گیا کہ ابتدائی مدرسہ فوری طور پر شروع کیا جاسکے کیونکہ سرسید اور اُن کے رفقاء کا بھی یہ خیال تھا کہ اُن کے منصوبے کا عملی نمونہ سامنے آجائے تو مخالفت کم ہوجائے گی چنانچہ سرسید نے شمال مغربی اضلاع کے لیفٹیننٹ گورنر سر جان سٹریچی کی مدد سے علی گڑھ میں ابتدائی مدرسہ کے لیے کچھ جگہ حاصل کرلی گئی جہاں ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم کا افتتاح ڈپٹی کلکٹر مولوی محمد کریم کے ہاتھوں ہوا۔ شیخ محمد اکرام نے اس مدرسے کی مخالفت کرنے والے علماء اکرام کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے۔ دونوں معزز سرکاری ملازم یعنی مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج۔ حالیؔ نے لکھا ہے کہ 'ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف وجوانب سے ہوئیں اُن کا منبع انھی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں' اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق

تھا۔''(۲۱)

مولوی امداد العلی کو سرسید نے کئی دفعہ مدرستہ العلوم کے منصوبے میں شریک ہونے کے لیے راضی بھی کرنا چاہا تھا کیونکہ سرسید انھیں اپنے دوستوں میں شمار کرتے تھے اور اس منصوبے میں اُن کی شرکت کو قوم کے لیے مفید گردانتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مولوی امداد العلی ایک ایسے عہدے پر تھے جہاں مدرستہ العلوم کے لیے چندہ جمع کرنے میں کافی مدد کر سکتے تھے۔ سرسید لکھتے تھے کہ:

''مولوی سید امداد العلی خان بہادر جو فضل الٰہی سے ہماری قوم میں ایک بہت بڑے اعلیٰ افسور ئیس ہیں اور ہمارے بہت بڑے شفیق دوست ہیں مدرستہ العلوم میں اُن کے شریک نہ ہونے سے ہم کو بہت رنج ہے اور نیز قوم کی بھلائی میں نقصان ہے اور ہم جب اُن سے ملتے ہیں مدرستہ العلوم میں شریک ہونے کی التجا کرتے ہیں۔ دربار دہلی میں بھی ہم نے اُن سے التجا کی اُنھوں نے فرمایا کہ دو شرط سے ہم شریک ہوں گے: اول یہ کہ ''تہذیب الاخلاق'' کا چھاپنا بند کرو یا اُس میں کوئی مضمون متعلقہ مذہب مت لکھو۔ دوسرے یہ کہ اپنے عقائد و اقوال سے جو برخلاف علمائے متقدمین ہیں توبہ کرو۔ پچھلی بات تو میرے اختیار سے باہر تھی کیوں کی جس بات پر میں یقین رکھتا ہوں جب تک وہ یقین زائل نہ ہو کیوں کر اُس کو دل سے کھو سکتا ہوں۔۔۔ ہاں پہلی بات میرے اختیار میں ہے اگر آپ مدرستہ العلوم کی تائید میں دل سے شریک ہوں میں آج ہی تہذیب الاخلاق کو بند کر دوں گا۔''(۲۲)

سرسید کی تمام کوششوں کے باوجود اُن کے مخالفین نے اپنی روش نہیں بدلی۔ ۱۸۷۶ء میں سرسید پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڑھ آ گئے اور مدرستہ العلوم کو کالج کا درجہ دلانے کے لیے سرگرم ہوئے۔ سرسید کی چند ماہ کی محنت بار آور ہوئی اور ۸/جنوری ۱۸۷۷ء کو وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے ہاتھوں ایم اے او کالج (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ سرسید نے اس کالج کی ترویج کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم جاری رکھی اور اسے مسلمان طالب علموں کے لیے ایک اعلیٰ دانش گاہ کے درجے تک پہنچایا۔ اس منصوبے کے لیے سب سے زیادہ امداد پنجاب سے ملی اور انھیں یہاں خوب پذیرائی بھی ملی۔ سرسید آخری وقت تک اس ادارے کی ترقی کے لیے کوشاں رہے کہ اُن کے خیال میں مسلمانوں کو سیاسی سطح پر بیدار کرنے کے لیے یہ ادارہ ایک مرکزی حیثیت کا حامل ہو سکتا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد ۱۹۲۲ء میں اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا اور بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ ادارہ برصغیر کے مسلمانوں کی فکری و عملی رہنمائی کا کام انجام دیتا رہا۔

یہاں سے سرسید کی سیاسی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلا دور جو اُن کی انگلستان روانگی تک کا ہے، میں وہ ۱۸۵۷ء کے بعد سیاسی سطح پر سرگرم ہوئے اور مختلف تصنیفی اور عملی اقدامات کے ذریعے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں اور انگریز حکمرانوں کے درمیان حائل نفرت کی فصیل گرانے کے لیے کوشاں رہے۔ دوسرا دور جو اُن کی انگلستان سے واپسی کے بعد شروع ہوا، میں پوری توجہ مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور تعلیمی ترقی پر مرکوز رہی اور اُس کے تناظر میں بھی سرسید کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو سیاسی اور تہذیبی زوال سے نکال کر الگ قوم کی حیثیت سے ایک پہچان عطا کرنے کا تھا۔ تیسرا دور ۱۸۷۸ء سے شروع ہوتا ہے اور اس میں سرسید باضابطہ اور عملی طور پر ایک سیاسی ڈھانچے کا حصہ بن گئے اور آخری وقت تک مختلف حوالوں سے اپنی قوم کی ترقی کے لیے سرگرم رہے۔

''اسباب بغاوتِ ہند'' میں انھوں نے بغاوت کی جہاں دیگر کئی وجوہات بیان کی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مقامی لوگوں کو لیجسلیٹو کونسل میں شامل نہیں کیا گیا۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا مقصد بھی یہی تھا کہ مقامی لوگ اس کے توسط سے اپنے مسائل لیجسلیٹو کونسل تک براہِ راست پہنچا سکیں۔ ۱۸۷۸ء میں بالآخر سرسید کی یہ مساعی کامیاب ہوئیں اور وہ لارڈ لٹن کی وائسرائگل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ لارڈ لٹن کے بعد لارڈ رپن نے بھی انھیں اپنی لیجسلیٹو کونسل کا ممبر منتخب

کیا۔سرسید نے کونسل کی ممبری کے دور میں دو پرائیویٹ بل منظور کرائے جبکہ تیسرا بل پیش ہونے سے قبل ہی کچھ قانونی پیچیدگیوں کی نذر ہو گیا۔ پہلا بل ستمبر ۱۸۷۹ء میں پیش کیا گیا جو ایک ایسا قانون بنانے کی غرض سے تھا جس کے تحت اضلاع شمال مغرب، اودھ، برٹش برما، اجمیر، آسام اور کچھ دیگر علاقوں میں چیچک کے موذی مرض سے بچاؤ کے لیے ٹیکا لگانا لازمی قرار دیا جانا تھا۔کونسل میں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے سرسید کے اس بل کی مخالفت میں رائے دی جبکہ باقی اراکین نے اس کے حق میں ووٹ دیا اور کثرتِ رائے سے یہ بل منظور ہو گیا۔دوسرا بل سرسید نے ۱۸۸۰ء میں پیش کیا جو قاضیوں کے تقرر کے حوالے سے ایک قانون بنانے کی بابت تھا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ قاضیوں کے تقرر اور ذمہ داریوں کے حوالے سے جملہ قوانین جو ۱۸۶۴ء میں حکومتِ ہند نے منسوخ کر دیے تھے، بحال ہوں۔اُس وقت یہ قرار پایا تھا کہ اس قسم کی تقرریوں کا گورنمنٹ کے اختیار میں ہونا قرینِ مصلحت ہے کیونکہ یہ معاملہ ایک خاص مذہب کے لوگوں سے تعلق رکھتا ہے جو قاضیوں کو اہمیت دیتے ہیں سو اگر کسی قاضی کو کوئی مذہبی رسم مثلاً نکاح وغیرہ انجام دینا ہو تو اسے اپنے طور پر دے نہ کہ حکومت کے ملازم کے طور پر۔سرسید کا خیال تھا کہ ان تقرریوں کو حکومتی تحویل میں دینے سے چند قدیم قاضیوں کے لیے سرکاری ملازمت کا سلسلہ بننے کے علاوہ مسلمانوں کے مذہبی اموران کی مذہبی روایات کے مطابق طے پائیں گے۔سرسید کا پیش کردہ یہ بل بھی کسی قدر مخالفت کے بعد کثرتِ رائے سے پاس ہو گیا۔تیسرا بل جو سرسید نے کونسل میں پیش کرنے کے لیے تیار کیا ''قانون جائیداد موقوفہ خاندانی اہل اسلام'' کے نام سے تھا لیکن یہ بل کونسل میں پیش نہ کیا جا سکا۔دراصل سرسید خواہ بذاتِ خود ایک جاگیردار، رئیس یا نواب خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے لیکن اُن کے حلقۂ احباب میں شامل لوگ بیشتر اسی طبقے سے تھے اور قومی سطح پر قائم کی جانے والی ہر سوسائٹی، ادارہ یا ایسوسی ایشن میں یہی لوگ نمائندگی کرتے تھے سرسید کی طرف سے انہی امراء، رئیسوں اور نوابوں کو زیادہ اہمیت حاصل رہی یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کے وقار اور عزت کی ضمانت بھی اس طبقے کے وقار اور مرتبے کی بقاء میں تلاش کرتے تھے۔اسی سوچ کے تحت انھوں نے سنی اور شیعہ دونوں مسالک کی فقہی کتب کو سامنے رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قانونی طور پر ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی جائیداد اپنی اولاد اور بعد کی نسل کے لیے ہمیشہ کو وقف کر دے تاکہ وہ جائیداد کبھی بیع ہو سکے نہ وراثت میں تقسیم ہو سکے اور اپنی اصل میں ہمیشہ برقرار رہے۔اُن کا خیال تھا کہ ایسا قانون پاس ہونے سے مسلمانوں کے رئیس اور ذی مقدور خاندانوں کی جائیدادیں قرضوں میں فروخت نہیں ہوں گی اور وہ کبھی مفلس نہیں ہوں گے۔بل پیش ہونے سے قبل ہی مختلف علماء اور دیگر لوگوں نے اس بنا پر مخالفت شروع کر دی تھی کہ سرسید مخصوص طبقے کے مفادات کے لیے یہ سب کر رہے تھے۔سرسید کے خلاف فتاویٰ دینے والے علماء میں ابوسعید عظیم آبادی نسبتاً نمایاں تھے۔

زاہد چودھری کے خیال میں سرسید جس دور میں مذکورہ بل تیار کر رہے تھے اُن کی نظر عالمی سیاسی منظرنامے پر زیادہ گہری نہیں تھی، لکھتے ہیں کہ:

> ''اس وقت تک وہ برطانیہ کے بورژوا انقلاب کے نتائج کا موقع پر مشاہدہ کر چکا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس انقلاب کی طبقاتی نوعیت کو نہیں پہچان سکا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ یہ انقلاب دراصل لوہاروں، ترکھانوں، جولاہوں اور دوسرے خدمتیوں کا ہی برپا کیا ہوا تھا اور نئی چمکدار سرمایہ دارانہ تہذیب کی عمارت بھی انہیں خدمتیوں نے ہی تعمیر کی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ ۱۸۴۸ء میں فرانس اور آسٹریا میں کمیونسٹوں کی ناکام بغاوتوں کے بعد اب یورپ میں مارکسی نظریے کی بنیاد پر ایک اور طبقاتی انقلاب کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ بظاہر ہندوستان کے اس وقت کے مخصوص نوآبادیاتی حالات اسے برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک کے ان حقائق سے واقفیت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔''(۲۳)

مسلمانوں کے مفاد میں تیار کیے گئے اس مسودۂ قانون کی مخالفت مسلمانوں ہی نے کی۔کونسل کے اراکین سرسید

کے کچھ دوستوں نے بھی یہ رائے ظاہر کی کہ کسی جائیداد کو ہمیشہ کے لیے نا قابلِ انتقال بنانا کسی طور درست نہیں اور موجودہ صورتحال میں اس قانون کے پاس ہونے کی اُمید کرنا بھی مشکل ہے لہٰذا انھوں نے یہ بل لیجسلیٹو کونسل میں پیش ہی نہ کیا۔ کونسل کی ممبرشپ کے دوران ان تین قوانین کے علاوہ سرسید کی مختلف مواقع پر بہت سی تقاریر اور لیکچرز بھی ایسے ہیں جو خاص سیاسی ایجنڈے کے تحت دیے گئے اور اُن کے سیاسی افکار کو سمجھنے میں نہایت مددگار ہیں۔ لارڈ رپن کے عہد میں سرسید کی کونسل ممبرشپ ختم ہونے میں کچھ دن باقی تھے کہ انھوں نے ایم او کالج کو مکمل توجہ دینے کی غرض سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۸۸۳ء میں سرسید نے ''محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن'' قائم کی جس کا مقصد مسلمان نوجوانوں کے لیے یورپ جا کر سول سروس کا امتحان دینے میں مدد مہیا کرنا تھا۔ اس ایسوسی ایشن کے تمام ممبروں کو آمادہ کیا گیا کہ وہ دو روپیہ فی کس ماہانہ چندہ اس مقصد کے لیے دیا کریں گے۔ اسی مقصد کے لیے مدرسۃ العلوم میں انھوں نے ایک کلاس بھی قائم کی جس کا نام سول سروس کلاس رکھا گیا اور اس میں مذکورہ امتحان کے لیے طالب علموں کو تیاری کرائی جاتی تھی۔ سرسید کی یہ تدبیر کامیاب نہ ہوسکی کہ تو ہم پرست مسلمان اور ہندو یورپ کے سفر کے لیے آمادہ نہ تھے اور اسے مذہب اور ذات کے قواعد کے منافی خیال کرتے تھے۔ اس ایسوسی ایشن کے فنڈ میں جو چار ہزار ایک روپے جمع ہوئے سرسید نے الٰہ آباد بنک میں جمع کرا دیے اور ان سے حاصل ہونے والا منافع ایم اے او کالج علی گڑھ کے طلبہ کے لیے مختص کیا گیا۔ اسی سال سرسید نے محمڈن ایسوسی ایشن علی گڑھ بھی قائم کی لیکن وہ بھی چند روز کا قصہ ہوگئی۔ یہ وہ دور تھا جب اُن کی تمام تر توجہ کالج پر مرکوز تھی اور تحریکِ علی گڑھ میں شامل اُن کی دیگر رفقاء بھی اپنی منفرد تصانیف کے ساتھ منظرِ عام پر آ رہے تھے۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا پہلا باقاعدہ اجلاس دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ہوا جس میں بہت سے موضوعات زیر بحث آئے۔ اس اجلاس میں حکومت سے کچھ مطالبات بھی کیے گئے جن میں سے دو یہ تھے کہ موجودہ مقامی لیجسلیٹو کونسلوں میں زیادہ منتخب ممبروں کو جگہ دی جائے اور متعہدہ سول سروس کے امتحانات ہندوستان اور برطانیہ میں ایک ہی وقت میں لیے جائیں (۲۴) کانگرس کے اجلاس کی رپورٹیں اشاعت پذیر ہوئیں تو اس کے مقاصد واضح ہوئے۔ سرسید نے مسلمانوں کے لیے ان مقاصد اور مطالبات کی تائید کرنا ہر طرح سے نامناسب قرار دیا کہ اُن کے خیال میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ وہ سیاسی طور پر سرگرم ہوں اور اس قسم کے مطالبات میں شریک ہوں۔ مولانا حالی نے سرسید کے ان خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''انھوں نے خیال کیا کہ کانگرس کے اصلی اور مقدم مقاصد ایسے ہیں کہ اگر وہ پورے ہو جائیں تو مسلمانوں کی پولیٹکل حالت کو سخت صدمہ پہنچنے کا خدشہ ہے مثلاً مقابلے کا امتحان جو متعہدہ عہدوں کے لیے ولایت میں ہوتا ہے اُس کا ہندوستان میں ہونا اور تمام متعہدہ عہدوں کا مقابلے کے امتحان کے ساتھ مشروط ہونا یا لیجسلیٹو کونسل میں رعایا کے انتخاب سے ممبروں کا مقرر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسی کے ساتھ اُن کو معلوم ہوا کہ مدراس میں جو عنقریب کانگرس کا اجلاس ہونے والا ہے اس میں بعض تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے اُن کو ضروری معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اُن نتائج سے آگاہ کر دیں جو اُن کے نزدیک کانگرس میں شرکت سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے۔'' (۲۵)

انڈین نیشنل کانگرس کا دوسرا اجلاس کلکتہ میں ۱۸۸۶ء میں منعقد ہوا تو اس میں کچھ مسلمان بھی شریک ہوئے جبکہ اس کے پہلے اجلاس میں ان کی شرکت نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوسرے اجلاس میں مسلمانوں کے کچھ سیاسی رہنماؤں مثلاً سید امیر علی اور نواب عبداللطیف نے شرکت سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اس جماعت کے مطالبات مسلمانوں کے مفاد میں نہیں۔

۲۷؍دسمبر ۱۸۸۶ء کو سرسید نے علی گڑھ میں ''محمڈن ایجوکیشنل کانگرس''(۲۶) کی بنیاد رکھی اور اس کا پہلا اجلاس ایم اے او کالج میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولوی محمد سمیع اللہ خان نے کی۔ اس اجلاس میں مختلف علاقوں کے مندوبین کے علاوہ کالج کے ڈیڑھ سو طلبہ نے بھی شرکت کی۔ سرسید نے اس موقع پر یہ تجویز پیش کی کہ:

> ''مسلمانوں میں ہر قسم کے تعلیمی تنزل کا لحاظ کر کے اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہو کہ جو ''محمڈن ایجوکیشنل کانگرس'' کے نام سے موسوم ہو یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا بلکہ ہر سال کسی ایسی جگہ پر جہاں لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے کی خواہش کریں اور انتظام فرمادیں گے منعقد ہوا کرے گا۔''(۲۷)

سرسید نے یہ تنظیم چونکہ انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کے ایک ہی سال بعد قائم کی تھی اس لیے اس تاثر کا ابھرنا فطری تھا کہ یہ مخالفت میں قائم ہوئی ہے۔ دراصل اس کے قیام کا اصل مقصد ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کو تعلیمی مقاصد کے حصول کے لیے ایک ہی مرکز پر اکٹھا کرنا تھا جہاں تک سیاسی مقاصد کا تعلق ہے تو محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کے پہلے اجلاس میں سرسید نے جو تقریر کی تھی اُس کے بعض حصوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایک ایسا متبادل پلیٹ فارم مہیا کرنا چاہتے تھے جہاں اُن کی توجہ تعلیمی ترقی کی طرف ہی مبذول رہے اور اُن میں وہ سیاسی جذبات پیدا نہ ہوں جن کے تحت کانگرس نے سرکار سے مطالبات کا آغاز کر دیا تھا کیونکہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے انگریزوں کے ہم پلہ نہیں تھے۔ سرسید نے کانگرس کے پہلے اجلاس سے تقریر میں ان خیالات کا اظہار یوں کیا تھا:

> ''جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں، ہماری قوم کو اس وقت بجز قومی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جائے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔''(۲۸)

شیخ محمد اکرام اس تنظیم کی خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں کئی لحاظ سے ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کالج سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوئی مختلف اور دُور دراز مقامات پر جہاں سے شاید علی گڑھ کالج میں صرف دو یا تین طلبہ تعلیم کے لیے آتے تھے اس کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے اُن میں شبلی اور حالی اپنی نظمیں پڑھتے۔ مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک اور خواجہ غلام الثقلین لیکچر دیتے اور وہاں ایک نئی زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے۔ اس کے علاوہ ''مسلم لیگ'' کے قیام سے پہلے سیاسی و نیم سیاسی امور میں کانفرنس ہی قوم کی آواز سمجھی جاتی تھی۔''(۲۹)

تاراچند نے بھی سرسید کی اس تنظیم کو خواہ اس کے مقاصد میں تعلیم کا حوالہ بنیادی تھا ایک سیاسی جماعت قرار دیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

> ''۱۸۸۶ء میں سید احمد خاں نے محمڈن (بعد میں مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جو حقیقت میں ایک سیاسی جماعت تھی اس کا مقصد تمام شہروں اور قصبوں میں شاخیں قائم کر کے مسلمانوں کی تعظیم کرنا، مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لینا اور اُن کی زراعتی، تجارتی اور صنعتی ضرورتوں کے متعلق تحقیقات کرنا۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں میں اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے اور مسلم سماج میں ایک نیا شعور بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔''(۳۰)

سرسید ابتداء سے اخیر دم تک مذکورہ جماعت جس کا نام کافی تبدیلیوں کے بعد ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' طے پایا تھا کے سیکرٹری کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کے بعد دو برس تک سرسید نے اُس جماعت کے مقاصد اور شائع ہونے والی رپورٹس کا جائزہ لیا اور بالآخر دسمبر ۱۸۸۷ء کو جب کانگرس کا تیسرا اجلاس مدراس میں منعقد ہو رہا تھا جس کی صدارت بدرالدین طیب جی کر رہے تھے' دوسری طرف مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس لکھنو میں بلایا گیا جس کی صدارت منشی محمد امتیاز علی علوی وکیل نے کی۔ کانگرس نے حکومتِ ہند سے جمہوری اور نمائندہ اداروں کا مطالبہ کیا تو سرسید نے اس کی پُر زور مذمت کی کیونکہ اُن کے خیال میں اس اقدام سے مسلمان جو ہندوستان میں اقلیت تھے پر اکثریت کا غلبہ ہو جاتا۔ وہ مسلمانوں کے لیے سیاسی ملازمتوں میں بھی ایک غیر متناسب حصہ چاہتے تھے اور اس بنا پر انھوں نے کانگرس کے اس مطالبے کی بھی مخالفت کی تھی کہ سول سروس کا امتحان ہندوستان شروع کیا جائے، وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی نسبتاً بہت زیادہ تھی اور اس سے یہ بھی ممکن تھا کہ ادنیٰ ذات کے بی اے اور ایم اے تک تعلیم یافتہ لوگ حاکم بن جاتے اور یہ ہندوستان کے اُس اشرافیہ طبقے کو پسند نہیں تھا جسے سرسید نے سیاسی سطح پر ہمیشہ زیادہ اہمیت دی۔ سرسید کی سیاسی فکر کے اسی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی لکھتے ہیں کہ:

> ''سرسید سیاسی اعتبار سے قدامت پسند تھے۔ وہ نمائندہ ی یا نیابتی حکومت یا منتخبہ نمائندوں کے تخیل کے شدید مخالف تھے۔ ان کے خیال میں حکومت صرف اعلیٰ خاندانوں کے افراد ہی کر سکتے ہیں اور حکومت کے اعلیٰ عہدے بھی اونچے خاندانوں کو ملنے چاہئیں۔ اس لیے کہ ہندوستانی رؤسا اور اشراف اسے برداشت نہ کریں گے کہ ان پر نیچی ذات یا کم حیثیت کے افراد حکومت کریں۔ کانگرس کی مخالفت کی ایک بہت بڑی وجہ اُن کی یہ افتادِ مزاج بھی تھی۔''(۳۱)

کانگرس کی مخالفت کے ضمن میں تاراچند لکھتے ہیں کہ:

> ''اُن کے ذہن میں یہ خیال پرورش پانے لگا کہ اگر کانگرس اپنے مطالبات کی منظوری پر حکومت کو آمادہ کر سکی، جن میں سب سے اہم مطالبہ تھا کونسلوں میں ہندوستان کو نمائندگی دینا تو مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ کانگرس کی مخالفت کرنے اور مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دینے کی معقول وجوہ تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک ایسے نظام میں جس سے راست انتخابات کیے جائیں مسلمانوں کے لیے جو اقلیت میں تھے، کونسلوں میں جگہ پانے کے امکانات کم تھے۔''(۳۲)

یہ پہلو عیاں ہے کہ ہندوستان میں جن جدید علوم کے فروغ کے لیے وہ ہمیشہ فکری اور عملی طور پر سرگرم رہے اُن کے حصول سے لوگوں میں سیاسی شعور بیدار ہونے لگا تھا اور انگریز تسلط سے آزادی کی باتیں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ سرسید کو یہ بالکل پسند نہ تھا کیونکہ اُنھیں یہ خدشہ تھا کہ قوم پرستی کے جذبات کی نشوونما، سیاسی امور کو زیرِ بحث لانے اور طبقاتی تفاوت کا شعور بیدار کرنے سے ملک میں افراتفری کی فضا پیدا ہو سکتی تھی اور اس کے خواہشمند لوگوں کو سرسید نے 'ایجی ٹیشن' کا شکار طبقہ قرار دیا۔ انڈین نیشنل کانگرس اور بنگال کے کچھ ہندو اسی مہم کو لے کر چل رہے تھے جس کی وجہ سے سرسید نے مسلمانوں کو ان سے دُور رکھنے کی کوشش کی۔ سرسید کے اس رویے سے اُن کی ذات میں پنہاں تضاد بھی واضح ہوتا ہے۔ قاضی جاوید لکھتے ہیں کہ:

> ''اُن کے فکر و عمل کے ہر پہلو میں گہرا تضاد اور ثنویت موجود تھی اسی تضاد کی بنا پر ایک طرف تو سید احمد خاں گزشتہ صدی کے ہندوستان میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کے سب سے زیادہ پُر جوش حامی تھے اور انھوں نے لارڈ میکالے کی حکمتِ عملی اور نقطۂ نظر کی پُر زور وکالت کی تھی لیکن دوسری طرف وہ جدید علوم کی اشاعت سے پیدا ہونے والی سماجی، سیاسی اور ذہنی اثرات سے بھی سب سے زیادہ خائف تھے وہ خاص طور پر بنگال

کے تعلیم یافتہ لوگوں کے سیاسی رویے سے بہت زیادہ نالاں تھے۔۔۔اُن کی کوشش یہ تھی کہ اہل ہند جدید علوم تو حاصل کریں لیکن اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی وسیاسی شعور سے بے بہرہ رہیں۔''(۳۳)

سرسید کی عملی زندگی کا ایک حصہ بطور ممبر پبلک سروس کمیشن بھی تھا۔۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن نے انہیں اس عہدے کے لیے منتخب کیا۔کمیشن میں شمولیت کے بعد سرسید کی کارگزاریوں،تقاریراور مباحثوں پر مشتمل مواد کہیں بھی تحریری صورت میں اکٹھا نہیں کیا جاسکا اور سرسید کے کسی سوانح نگار نے بھی اس حوالے سے خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی۔

کانگرس کی مخالفت میں تقاریر پر ہی سرسید نے اکتفا نہیں کیا بلکہ ۱۸۸۸ء کو علی گڑھ میں ''پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' کی بنیاد رکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسے ذی مقدور مسلمانوں اور دوسری قوموں کے لوگوں جو کانگرس کی مخالفت میں اپنی اپنی مخصوص آراء اور خیالات رکھتے تھے،کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جائے اور اُن کے خیالات اور خطوط ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے انگلستان کے لوگوں اور پارلیمنٹ کے ممبران کو بھجوائے جائیں اور اخبارات میں بھی شائع ہوں تا کہ اس بات کا یقین دلائے جائے کہ ہندوستان کی بہت سی نمائندہ شخصیات اور کچھ قومیں بالخصوص مسلمان کانگرس میں شریک نہیں تھے بلکہ مخالف تھے۔اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے کئی صوبوں مثلاً اضلاع شمال مغرب،اودھ،پنجاب،بہار،مدراس اور ریاست حیدرآباد کے تعلقہ داروں نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کانگرس کے خلاف جلسے بھی کیے۔سرسید کے اس اقدام کے خلاف سب سے زیادہ ردِعمل بنگال کے لوگوں اور اخبارات میں سامنے آیا جنھوں نے اُن کے گزشتہ خیالات وعملی اقدامات اور حالیہ مخالفت کو سامنے رکھتے ہوئے دوہری سوچ کی مالک شخصیت قرار دیا اور انگریز کا خوشامدی اور زمانہ ساز کہا گیا اس کے باوجود انھوں نے اخیر دم تک اپنی یہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔یہ تنظیم دوسال تک سیاسی خدمات انجام دینے کے بعد ختم ہوگئی۔اس کے بعد انھوں نے ایک دوسری انجمن ''محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف ایرانڈیا'' کے نام سے دسمبر ۱۸۹۳ء میں قائم کی جس میں اُن کی معاونت ایم اے او کالج علی گڑھ کے پرنسل تھیوڈر بیک نے کی۔یہ پلیٹ فارم جن سیاسی مقاصد کا حامل تھا اُن میں پولیٹکل ایجی ٹیشن کو پھیلنے سے روکنا اور برطانوی حکومت کے استحکام کے لیے عوام میں وفاداری کے جذبات زندہ رکھنا وغیرہ شامل تھے۔کچھ ہی عرصہ بعد یہ انجمن بھی ختم ہوگئی۔

سرسید نے مسلمانوں کی سیاسی خدمت کی جو تحریک شروع کی تھی اُس میں علی گڑھ کو ہمیشہ مرکز کی حیثیت حاصل رہی اور اس مرکز پر اُن کی سیاسی کارگزاریوں نے آگے چل کر بیسویں صدی میں ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں وہ تحرک پیدا کرنے میں معاونت کی جو آزادئ ہند پر منتج ہوا۔سرسید کے خیالات اور اقدامات کی بنا پر اُن کے کچھ رفقاء آخر میں اس تحریک سے کنارہ کش بھی ہوگئے تھے جن میں مولانا شبلی نعمانی،سمیع اللہ خان اور اُن کے دیگر دوست جو کالج کے ٹرسٹی شپ سے مستعفی ہو گئے تھے،شامل ہیں۔سرسید کی سیاسی خدمات کے بیان میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''سرسید نے مسلمانوں کی سیاسی خدمت کا آغاز ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے ذریعے کیا تھا لیکن یہ سیاست بڑی حد تک 'فدویانہ' تھی۔اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔مسلمانوں کے خلاف کنگھم رسل (Russell) اور سیسل بیڈن نے مخاصمانہ تحریک شروع کر رکھی تھی۔۔۔سرسید احمد خاں نے اپنی دوستانہ سیاست کا دوسرا قدم ۱۸۷۷ء میں ایم او کالج کے قیام اور ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کونسل میں نامزدگی کے بعد رکھا۔وہ دوسال بعد دوبارہ کونسل کے رُکن ہوئے۔۱۸۸۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں دی یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی جس کے بعض مطالبات سیاسی تھے۔یہ تبدیلی اس لیے واقع ہوئی کہ اب وہ حالات نہیں رہے تھے جن کی وجہ سے سیاست سے الگ تھلگ رہنا ضروری خیال کیا جارہا تھا۔''(۳۴)

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان جس سیاسی زوال کا شکار ہوا اور مسلمان جن سے اقتدار چھینا گیا تھا بدیسی حکمرانوں کا جس طور پر نشانہ بن رہے تھے اس صورتِ حال میں سرسید احمد خاں ہی واحد شخصیت تھے جنھوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کا بیڑہ اُٹھایا اور پسماندہ طبقے کے نظریہ ساز کے طور پر سامنے آئے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے ہندوستان کو سیاسی، معاشرتی، معاشی، مذہبی اور علمی پسماندگی سے نکال کر ایک ایسی سطح پر لا کھڑا کیا جہاں وہ سامراج کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوئے۔ اُن کی فکر اور عملی اقدامات نے اُس دور کے خیالات وعقائد میں جو انقلاب برپا کیا بلاشبہ وہ بیسویں صدی کی سیاسی تحاریک کا منبع ہے۔ سرسید احمد خاں نے عملی زندگی کا آغاز ایک مذہبی مصلح کی حیثیت سے کیا تھا اور یہی مصلحت اندیشی رفتارِ زمانہ کے ساتھ چلتے ہوئے سیاسی سوچ اور کارگزاریوں میں ضم ہو کر انھیں 'جاوید' کا مرتبہ عطا کر گئی۔

حوالہ جات / حواشی

۱۔ قاضی جاوید، ''سرسید سے اقبال تک''، اپریل ۱۹۷۹ء، لاہور، بک ٹریڈرز، ص ۱۱، ۱۲

۲۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''سرسید اور اُن کے نامور رفقاء کی اُردو نثر کا فنی وفکری جائزہ''، ۱۹۹۸ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۸

۳۔ غلام رسول مہر، ''مذہبی رجحانات'' مشمولہ ''۱۸۵۷: کوائف وصحائف''، مئی ۱۹۵۷، کراچی، ادارۂ مطبوعات پاکستان، ص ۴، ۵

۴۔ محمد باقر، ڈاکٹر، ''تعلیم'' مشمولہ ''۱۸۵۷ء: کوائف وصحائف''، ص ۸، ۹

۵۔ سرسید احمد خان، ''کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا؟'' مشمولہ ''لیل ونہار: جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) نمبر'' (مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد)، ۲۰۰۹ء، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ص ۱۴۳، ۱۴۴

۶۔ احتشام حسین، سید، ''اُردو ادب اور انقلاب ۱۸۵۷ء'' مشمولہ ''انقلاب ۱۸۵۷ء'' (مرتبہ)، ص ۲۴۹

☆ ۱۸۵۸ء میں اشاعت پذیر ہونے والی ''تاریخ سرکشی بجنور'' وہ پہلی تصنیف تھی جس سے سرسید کے ہاں عصری زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں میں دلچسپی کا عنصر واضح طور پر سامنے آیا ہے۔

۷۔ حالی، الطاف حسین، مولانا، ''حیاتِ جاوید''، فروری ۱۹۵۷ء، لاہور، پنجاب اکادمی، ص ۱۵۳، ۱۵۴

۸۔ قاضی جاوید، ''سرسید سے اقبال تک''، ص ۵۹

۹۔ حالی، ''حیاتِ جاوید''، ص ۱۵۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۱۱۔ مظہر حسین، ''علی گڑھ تحریک: سماجی اور سیاسی مطالعہ''، ۲۰۰۲ء، نئی دِلّی، انجمن ترقی اُردو (ہند)، ص ۶۰

۱۲۔ سرسید احمد خان، ''مقالاتِ سرسید'' (حصہ پانزدہم) مرتبہ: مولانا محمد اسماعیل پانی پتی، دسمبر ۱۹۶۳ء، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۷۷، ۷۸

۱۳۔ زاہد چودھری، ''روشن خیال، وسیع المشرب اور ترقی پسند سرسید احمد خان''، ۱۹۹۹ء، لاہور، ادارہ مطالعۂ تاریخ، ص ۳۸

۱۴۔ حالی، ''حیاتِ جاوید''، ص ۱۸۴

۱۵۔ زاہد چودھری، ''روشن خیال، وسیع المشرب اور ترقی پسند سرسید احمد خان''، ص ۳۹

۱۶۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، ''سرسید احمد خان: حالات وافکار''، ۱۹۹۸ء (اشاعت سوم)، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ص ۵۰

۱۷۔ صفیہ بانو، ڈاکٹر، ''انجمن پنجاب: تاریخ وخدمات''، ۱۹۷۸ء، کراچی، کفایت اکیڈمی، ص ۱۰۰

۱۸۔ زاہد چودھری، ''روشن خیال، وسیع المشرب اور ترقی پسند سرسید احمد خان''، ص ۴۲

۱۹۔ احتشام حسین، سید، ''ذوقِ ادب اور شعور''، ۱۹۵۵ء، لکھنؤ، ادارہ فروغِ اُردو، ص ۲۰۲، ۲۰۳

۲۰۔ سرسید احمد خاں، ''مقالاتِ سرسید'' (حصہ دہم) مرتبہ: مولانا اسماعیل پانی پتی، ص ۸۰

۲۱۔ محمد اکرام، شیخ، ''موجِ کوثر''، مئی ۲۰۰۰ء، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ص ۹۲، ۹۳

۲۲۔ سرسید احمد خاں، ''مقالاتِ سرسید'' (حصہ دہم)، ص ۵۶

۲۳۔ زاہد چودھری، ''روشن خیال، وسیع المشرب اور ترقی پسند سرسید احمد خان''، ص ۶۹

۲۴۔ مظہر حسین، ''علی گڑھ تحریک: سماجی اور سیاسی مطالعہ''، ص ۲۴۵

۲۵۔ حالی، ''حیاتِ جاوید''، ص ۳۱۶

۲۶۔ جلسۂ تاسیسی میں اس تنظیم کا نام ''محمڈن ایجوکیشنل کانگرس'' رکھا گیا تھا۔ بعدازاں اس کے اجلاس پنجم زیرِ صدارت سردار محمد حیات خاں منعقدہ دسمبر ۱۸۹۰ء بہ مقام الہٰ آباد میں ایک ترمیمی تجویز سے اس کے نام میں 'کانگرس' کو 'کانفرنس' میں تبدیل کر دیا گیا کہ اس سے یہ تنظیم انڈین نیشنل کانگرس کے مخالف معلوم ہوتی تھی۔ اجلاس دہم زیرِ صدارت نواب محسن الملک منعقدہ دسمبر ۱۸۹۵ء بہ مقام شاہجہانپور میں اس نام میں ایک اور جزوی ترمیم کی گئی اور ''اینگلو اورینٹل'' کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا اور یوں یہ نام ''اینگلو اورینٹل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' ہو گیا۔ ۳۶ویں اجلاس زیرِ صدارت صاحبزادہ آفتاب احمد خان منعقدہ ۱۹۲۳ء بہ مقام علی گڑھ اس نام میں کچھ اور ترامیم پیش کی گئیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ 'محمڈن' کی بجائے 'مسلم' کا لفظ لایا جائے یوں سرسید کی قائم کردہ ''محمڈن ایجوکیشنل کانگرس'' کا نام بہت سی ترامیم کے بعد ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' طے پایا۔

بحوالہ: اختر الواسع، پروفیسر، ''سرسید کی تعلیمی تحریک''، ۲۰۰۴ء (بار دوم)، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ص ۳۹، ۴۰]

۲۷۔ بحوالہ: اختر الواسع، پروفیسر، ''سرسید کی تعلیمی تحریک''، ص ۳۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۲

۲۹۔ محمد اکرام، شیخ، ''موجِ کوثر''، ص ۹۵

۳۰۔ تاراچند، ''تاریخ تحریکِ آزادیٔ ہند'' (جلد دوم)، ترجمہ: غلام ربانی تاباں، ۲۰۰۱ء، نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ص ۳۱۳، ۳۱۴

۳۱۔ قدوائی، محمد ہاشم، ڈاکٹر، ''جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار''، ۱۹۸۵، نئی دہلی، ترقی اُردو بیورو، ص ۴۸

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۰۹

۳۳۔ قاضی جاوید، ''سرسید سے اقبال تک''، ص ۲۱، ۲۲

۳۴۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، ''سرسید احمد خاں کی مذہبی فکر اور سیاست''، مشمولہ ''صحیفہ''، جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء، شمارہ نمبر ۱۷۴، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص ۱۵